

# اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

(۳)

(بلساء اشاعت ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ)

پچھلی دو اشاعتوں میں نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تحقیق کی گئی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسکو اسلام کا رکن اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جسکے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے، ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الہی کا بار سنبھالنے کے لیے فروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں۔ وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانبردار تسلیم کریں اور اسکے فرض شناس و اطاعت کیش بندے ہوں۔ اسلام کا نظام فکر و نظریہ حیات انکی رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق ان سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہوگئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہل ایمان سے الگ متاز ہو جائے۔ انکی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح بہیم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کا رفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدت روح اور وحدت عمل ہو، وہ قیادت اور

اقتدار کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں، اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہذا اسکو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں سبک ہو کر رہ جائیں اور وہ اس مقصد عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جسکی خاطر اسلامی جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عباد الدین ہے، یعنی دین کا سہارا ہے، جس نے اسے گرایا اس نے دین کو گرایا۔

## ۲- روزہ

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن، روزہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانہ سے اسلام کا رکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اسکی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفس روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الہی شریعتوں کا جزو لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل تھا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریق تربیت کو ضرور کوئی خاص مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے ساتھ مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام انہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی مترتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا معمولی نظام تربیت ہے جو ہر روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دیکر چھوڑ دیتا ہے۔ اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت ( Special training course ) ہے جو آدمی کو تقریباً

۷۰۔ گھنٹہ تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلین کے نیکو میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظام تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے، اور کس کس ڈھنگ سے نفس انسانی پر مطلوب اثرات ڈالتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

روز کے اثرات | روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب میں طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہونے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں ایک قطرہ آب اور خوراک کا ایک ربیزہ تک قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضا و شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکایک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں، یہاں تک کہ دوسرے روزے کی مقرر ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک ہفتہ تک مسلسل اسکی تکرار جاری رہتی ہے۔ گویا پورے تیس دن آدمی ایک شدید ڈسپلین کے تحت رکھا جاتا ہے۔ مقرر وقت تک سحری کرے، مقرر وقت پر افطار کرے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشات نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کرنی جائے تو ہر اس چیز سے رُک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

احساس بندگی | اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقہ سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اور اس شعور کو اتنا طاقت ور بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم (Surrender) کر دے۔ یہ اعتراف و تسلیم ہی دراصل اسلام کی جان ہے، اور اسی پر آدمی کے

مسلم ہونے یا نہ ہونیکامدار ہے۔ دین اسلام کا مطالبہ انسان سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس خداوند عالم کے وجود کو مان لے، یا محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کرے کہ اس کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف اللہ واحد قہار ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس امر واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اسکے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرے۔ یعنی جب وہ یہ ماننا ہے کہ اس کا اور تمام دنیا کا خالق، پروردگار، قیام بخش اور مدبّر امر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ نہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک ہے نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدبیر امر میں، تو اس تسلیم و اعتراف کے ساتھ ہی اسے اللہ کی حاکمیت و فرمانروائی کے آگے سپرد الدینی چاہیے، اپنی آزادی و خود مختاری کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہو جانا چاہیے، اور اللہ کے مقابلہ میں وہی بوس اختیار کر لینا چاہیے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازم ہے۔ یہی چیز دراصل کفر اور اسلام کے درمیان فارق ہے۔ کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقابلہ میں خود مختار اور غیر جواب دہ سمجھے اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے۔ اور اسلام کی حالت اسکے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے اور وہی احساس بندگی و ذمہ داری کیساتھ دنیا میں زندگی بسر کرے۔ پس حالت کفر سے نکل کر حالت اسلام میں آنے کیلئے جس طرح اللہ کی حاکمیت کا پتہ اور قلبی قرار ضروری ہے اسی طرح حالت اسلام میں رہنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں بندگی کا احساس مشہور ہر دم تازہ ہر وقت زندہ اور ہر آن گزارا ہو۔ کیونکہ اس احساس مشہور کو دل سے دور ہوتے ہی خود مختاری و غیر ذمہ داری کا رویہ عود کر آتا ہے اور کفر کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں آدمی یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ اس کا حاکم ہے اور نہ اسے اللہ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، نماز کا اولین مقصد انسان کے اندر "اسلام" کی اسی حالت کو پے در پے تازہ کرتے رہنا ہے، اور یہی روزے کا مقصد بھی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانہ

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۷۰ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ دل و دماغ میں بیٹھ جائے اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں۔ اول تو روزے کے سخت ضابطہ کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اسکے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار نہ ہو چکا ہو۔ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹہ کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکا رہتا ہے اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات کا ایک ہاتھ کھینچ لیتا ہے، اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطالبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع اس کے ہاتھوں اور اسکے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جسکے بند کرنے سے وہ بند ہوتے اور جسکے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہا ہے، اس پورے ایک مہینہ کی طویل مدت میں یہ احساس اسکے شعور یا تحت الشعاع سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا، کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعت امر | احساس بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، ان کے درمیان کبھی تناقض (Inconsistency) کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ ایسے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعترافِ خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی نہ مان لیں، اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان

چکے ہوں تو اسکی بندگی و اطاعت کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم ماننا چلا جائے ورنہ ایک روہ اسکے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرات موجود ہے کہ جس کوئی الواقع وہ اپنے قلب و روح میں حاکم ذی اقتدار سمجھتا ہو اور جسے نافع و ضار اور پروردگار مانتا ہو اسکی اطاعت منہ موڑ جائے پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی و اطاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے اور یہ عین عقل اور منطوق کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) خداوند کے وہی معنی ہیں جو عربی میں الا اور رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (god) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیو یا دیوتا کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنی ہیں۔ ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی رہی ہیں جنکے ہاتھ میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اختیار ہوں، جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر چلتا ہو، جنکی بندگی بجالانے پر ہی انسان کی فلاح و کامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ اور ان میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ ادلیار اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں آلہ اور ارباب، فارسی میں خدائیں گان اور خداوندان، انگریزی میں (gods) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ آتے ہیں۔ مگر ان سب سے اوپر ایک ایسی ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائے خدائیں گان، انگریزی میں بڑے طرت کے ساتھ (God) اور ہندی میں مہا دیو اسی ہستی کے نام ہیں اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اختیارات و اقتدارات کے لیے تم الا اور خداوند وغیرہ الفاظ بولتے ہو وہ تنہا اسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ تمہارا نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور خداوند اور دیوتا مانتے ہو وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں، حقیقی اقتدار میں

ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں۔ لہذا الا اور رب اور خداوند اور گاڈ اور دیو بہت سے نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے یہ ہے کہ غیر مسلم کے لیے تو وہی پھلی اصطلاحیں برقرار رہیں گی اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کریں گے، مگر مسلمان کے لیے الا اور رب وہی ہو گا جو اللہ ہے، گاڈ صرف بڑے حرف کے ساتھ باقی رہے گا اور چھوٹے حرف سے اس کا استعمال نہ ہو گا، دیو اور دیوتا کے الفاظ ہادیو میں ضم ہو جائیں گے، خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہو جائیں گے اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائے گی۔

آقائی و خداوندی میں توحید لامحالہ بندگی و اطاعت میں توحید پر منتج ہوگی، اور آقائی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی و اطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خداوند سمجھینگے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریں گے۔ دس کی خداوندی تسلیم کریں گے تو بندگی و اطاعت کا رخ بھی ان دسوں کی طرف پھر جائے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجائیں یا خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذات خداوند کا تعین لامحالہ سمت بندگی کے تعین پر منتج ہوگا۔ آپ جبکی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے، مگر قلب و روح کے حقیقی احساس و شعور اور جو اس کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں کوئی عقل اس چیز کا تصور نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اسکے بجائے آپ کی بندگی کا رخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اسکے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جبکی طرف بھی آپ کی بندگی کا رخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقشہ دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے، خواہ زبان سے آپ اسکے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

خداوندی کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی و بیشی لازماً اطاعت امر کی کمی و بیشی پر منتج ہوگی۔ کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسکی اطاعت کریں گے، اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہو جائیگی، حتیٰ کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اسکے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرنا دینے سے اسکے سوا کچھ

نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے۔ جب وہ **إِلَّا لِلَّهِ الدِّينُ** الخالص کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً و مخلصاً صرف اللہ کے لیے ہے، کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کہتا ہے کہ **وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ**، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے، اور اسکی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اسکی اطاعت کے ساتھ کسی دوسری اطاعت مخلوط نہ کرے۔ جب وہ کہتا ہے کہ **قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلَّهُ لِلَّهِ** تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ ساتھ اسکی اطاعت بھی کرے یا خداوند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ**، تو اسکی صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور سارے پہلوؤں کے ساتھ اطاعت الہی کے نیچے آجائے، جسکی فرمانبرداری بھی ہو خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو، اور جس فرمانبرداری کے لیے وہاں سے حکم یا سنو جو از نطے اسکی بند کاٹ ڈالا جائے، یہ اُس دین حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ اپنے رسول کے ذریعے بھیجتا ہے اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان اور سائیکھی ہو، خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ امیر و لیڈر ہو، خواہ علماء و مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جسکی انسان ملازمت کر کے پیٹ پالتا، اور خواہ انسان کا اپنا نفس ہو، اسکی

۱۔ لفظ "دین" کے اصلی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور مذہب و ملت کے لیے اس لفظ کا استعمال مجازاً اس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت دراصل ایک نظام اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہوجانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرمانبرداری اختیار کر لیتا ہے۔



خواہشات ہوں، کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اسکی خداوندی کا اقرار کر چکا اور جس نے اسکے لیے اپنی بندگی کو خالص کر لیا، وہ جس کی اطاعت بھی کریگا اللہ کی اطاعت کے ماتحت رہ کرے گا۔ جس حد تک جسکی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائیگی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کوئی کوئی گنہگار آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی (Elementary) ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ غذا کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گزار نہیں سکتا جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے۔ ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اسکے لیے حلال ہے خواہ تمام دنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہو جائے، اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اسکے لیے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کر دے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اسکے لیے اذن نہیں کسی کا حکم اسکے لیے حکم نہیں، اور کسی کی ہنسی اسکے لیے ہنسی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لیکر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جسکے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو۔ اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے، نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیر و پریڈر یا امام کی، نہ مرید پر پیر کی۔ بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور ۲۰ گنہگار کی اس طویل مشق و تہمت سے روزہ دار کے دل پر کا نقش فی الحجر یہ سکتا بیٹھا جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اسکی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی نقطہ کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹہ تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کرے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپن کے بند کھولے جائیں تو اسکی اطاعتیں اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں۔ اطاعت امر کی اس تربیت کے لیے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپن کی ساری پابندیاں صرف انہی دو پر لگائی گئی ہیں، لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور اپنی بندگی و عبادت کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے، اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گزارے کہ ہر اس چیز سے جس سے خدا نے روکا ہے، اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشوونما دینا ہے نہ کہ محض کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا۔ لہذا یہ کیفیت جتنی زیاد ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے، اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے، حتیٰ کہ اگر کسی آدمی نے روزہ اس احمقانہ طریقہ سے رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان کو پیرہنیز کرتا رہا، اور باقی تمام ان افعال کا ارتکاب کیے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے، تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں وہ اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جسکی وجہ سے انسان انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

من لم یردع قول النور و العمل بہ فلیس  
 جس نے جوڑ بولنا اور جوڑ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا  
 للہ حاجۃ فی ان ینعم طعامہ و شرابہ  
 کو اسکی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

جھوٹ بولنے کے ساتھ ”جھوٹ پر عمل کرنے“ کا لفظ جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔  
 دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اسکی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت  
 میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا  
 تھا، مگر جب وہ روزے کے دوران میں اسی کی تکذیب کرتا رہتا تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا  
 اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اسکے خلوتے معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں  
 حضور نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

کم من صائم ليس له من صيامه  
 الا الظمأ وكم من قائم ليس له من  
 قيامه الا السهر  
 کتنے ہی روز دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے  
 سوا انکے پے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے  
 والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رات جگے کے سوا کچھ حاصل  
 نہیں ہوتا۔

اور یہی بات ہے جس کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرمادیا کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى  
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ  
 تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں  
 پر فرض کیے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس ذریعہ سے تم  
 تقویٰ کرنے لگو گے۔

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ

کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اسکی نافرمانی

سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گذری ہے، وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب نے

بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا ”تقویٰ کسے کہتے ہیں؟“ انہوں نے عرض کیا، ”امیر المؤمنین

آپ کو کبھی کسی سیرت سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ

تنگ ہو؟“ حضرت عمر نے فرمایا۔ ”بارہا“۔ انہوں نے پوچھا ”تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟“ حضرت

نے فرمایا ”میں اپنا دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ الجھ جائے۔“

حضرت اُبی نے کہا ”بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔“ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، دونوں طرف افراط اور تفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات (temptations) گمراہیوں اور تافریبیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچائے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے، اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خدا ترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے، اور جو قوت روزہ دیتے ہوئے اسکو لینے کے لیے تیار ہو، اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوفِ خدا اور اطاعتِ امر کی صفت کو نشوونما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اسکے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہ راہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے۔ اس صورت میں اسکے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامرک اعمال میں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پاسکتا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

کل عمل ابن آدم یغناہ عن الحسنۃ  
 بعضہ امثالہا الی سبع مائۃ ضعف۔  
 قال اللہ تعالیٰ اکا الصوم فائزۃ لی و  
 انا اجزی بہ۔

آدمی زادے کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔  
 ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک بھلتی چھوٹی ہے۔  
 مگر اللہ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے، جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔

یعنی روزے کے معاملہ میں بالیدگی و افزونی کا امکان بے حد و حساب ہے۔ آدمی اس سے تقویٰ

حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے۔ صفر کے درجہ سے لیکر اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں گئے تک وہ جاسکتا ہے بلکہ بلا نہایت ترقی کر سکتا ہے۔ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعداد اخذ و قبول پر منحصر ہے کہ روزہ سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے، اور کرے تو کس حد تک کرے، اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزے رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤ گے، بلکہ لعلکلمہ کا لفظ استعمال فرمایا جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے یا ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو۔

**تعمیر سیرت** | یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے۔ جس نوعیت کا کبیر کٹر اسلام پر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی لفظ تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل و وضع بنا لینا، چند مشہور و نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے، بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔ حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ قرآن مجید انسانی طرز خیال و طرز عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں پر تقسیم کرتا ہے :-

ایک قسم وہ ہے جس میں انسان :

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان :

(۱) دینی طاقتوں کے ساتھ کسی بالاتر اقتدار کو اپنی

دانا اپنے آپ کو ایک ایسے بالاتر حکمراں کا تابع اور اسکے

سائے جواہر سمجھتا ہے جو عالم الغیب الشہادہ ہے اور یہ سمجھتا ہے

اور پر نگراں نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتا ہے کہ زندگی بسر کرتا ہے کہ

لہ عام طور پر لوگ اس لفظ کا ترجمہ "تاکہ" کرتے ہیں۔ مگر یہ لغت اعتبار سے درست نہیں۔ لعل کا لفظ عربی میں امید، توقع،

اندیشہ اور امکان بلا وثوق کا مفہوم اور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے تاکہ میں محض تعمیل یا غرضیت کا مفہوم ہے۔ اگر

اللہ تعالیٰ کو صرف غرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوتی تو لعلکلمہ ستون کے بجائے لعلکلمہ ستون المتعین فرمایا ہوتا۔ شاید لوگ اس موقع پر کلمہ

شک کو دیکھ کر اسکی حکمت نہ سمجھ سکے اس لیے انہوں نے لعل کا ترجمہ "تاکہ" کر دیا، تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات نبی نظر نہ آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے

بن جائے۔

اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک عین اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے۔

(۶) دنیوی زندگی ہی کو زندگی اور دنیوی فائدے ہی کو

(۶) دنیوی زندگی کو اصل جیسا انسانی ماحول ایک تبدیلی

فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس

مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد و نقصانات کو جو اس مرحلہ میں ہر پورے

بننا پر کسی طریقے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف

ہیں اعلیٰ اور دھوکا دینے والے نتائج خیال کرتا ہے

دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے۔

اور اپنے طرز عمل کا فیصلہ ان منتقل فائدوں اور نقصانات

کی بنیاد پر کرتا ہے جو آخرت کی پابندار زندگی میں نظر ہوں گے۔

(۷) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی

(۷) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی

فضائل کو یہ وقعت سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کے مقابلہ

فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی

میں اخلاقی و روحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے۔

نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے

(۸) کسی منتقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا

(۸) ایک ایسے منتقل اخلاقی دستور

بلکہ موقع و محل (Circumstances) کے

کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اعتراض و

لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دیگر

مصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم و تنسیخ کرنے

موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔

کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرز خیال و طرز عمل کا جامع نام قرآن نے ”مخیر“ رکھا ہے اور دوسرے

طرز خیال و عمل کو وہ ”تقویٰ“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو با

لئے توجہ کی اصطلاحوں میں ہم اسے مادی پرستی (Materialism) ، افاویتہ (Utilitarianism)

(مصلحت پرستی) (Pragmatism) اور ابن الوقتی (Opportunism) کے

ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

مغربی ذہن چونکہ اس طرز خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اس لیے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ

مشکل سے مل سکیں گے جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔

ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، اور اپنے نقطہ آغاز سے لیکر نقطہ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کر کے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آ سکتی ہیں، مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا، کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقویٰ کے فکری اجزاء میں سے کسی چیز کو بھی اُنکے اس مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر موقع و محل پر ایک دوسرا ہی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے۔ جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہل فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا۔ اسکی معاشرت میں، اسکی اخلاقیات میں، اسکی معاشیات میں، اسکی نظام تعلیم و تربیت میں، اسکی سیاست میں، اسکی بین الاقوامی رویہ میں، غرض اسکی ہر چیز میں فجور کی روح کار فرما ہوگی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اسکی اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں، مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اُس قوم کے مفاد میں گم کر دیں جسکی ترقی سے انکی اپنی ترقی اور جبکہ تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے۔ لہذا اگر شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہو تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ قومی رویہ بہر حال افادیت، ابن الوقتی، مصلحت پرستی اور ماوہ پرستی ہی کے اصولوں پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی جماعت متعین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے اور متقی ہی اسکے رہنما ہوتے ہیں تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ وقتی اور مہنگامی مصلحتوں کے

لحاظ سے اپنا طرز عمل مقرر نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل دستور کی پیروی کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مسمای وقف کر دیتی ہے قطع نظر اسکے کہ دنیوی لحاظ سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پاکہ اور اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مسلح نظر بناتی ہے۔ وہ موافق کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اصول حق کا اتباع کرتی ہے کیونکہ اسے اسکی پرہیزگاری نہیں ہوتی کہ اسکی مد مقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ، بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اسکے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنے کا جو وقت بہر حال آتا ہے اسکی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب "فجور" ہے۔ وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے یا کم سے کم اسکے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے۔ اس کام کے لیے وہ نوزع انسانی میں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحان طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان (Bent of mind) رکھتے والے لوگ اسکے کسی کام کے نہیں، خواہ وہ اتفاقاً مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی ترپیتے ہوں۔ اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں، جنکو قانون کی پابندی کے لیے کسی خارجی و باؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ خود اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں نفسین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہر حال انہیں جانا ہے،



جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں، جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جنکو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اسکے بتائے ہوئے اصول اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جنکی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنہیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایان کار بندگی حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگی باطل ہی کا انجام برا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو۔ پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جنکے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صبح اور بلند نصب العین کے لیے برسوں بلکہ ساری ساری عمر لگا کر سچی بے حاصل کر سکتے ہوں، جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے، اور لطف و لذت، کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستے پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لیے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے اس کے لیے ایسے ہی قابل اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کی اس صفت کا ہیولی (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو ان کے اندر اس صفت کو نشوونما دینے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے روزے سے زیادہ طاقتور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطہ پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور ہائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح

سے شام تک کچھ نہ کھاؤ نہ پیو۔ کوئی چیز حلق سے اتارو گے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائیگا۔ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور درپردہ کھاتے پیتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزداروں میں ہو مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا۔ تمہارا روزہ صحیح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے رکھو، اور نہ دوسری کسی غرض مثلاً صحت کی درستی یا نیک نامی کے لیے رکھو گے تو خدا کی نگاہ میں اسکی کوئی قیمت نہیں۔ خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کرو گے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دو گے یا نہ رکھو گے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائیگی۔ مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہو گے اسی وقت انعام بھی ملیگا اور اسی وقت سزا بھی دی جائیگی۔ یہ چند ہدایات دیکر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی سپاہی کوئی ہرکارہ کوئی سی آئی ڈی کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اسکی نگرانی کرے۔ زیادہ سے زیادہ رائے عام اپنے دباؤ سے اسکو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیے۔ مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اسکو روکنے والا کوئی نہیں۔ اور اس بات کا حساب لینا تو کسی راجہ عام یا کسی حکومت کے بس ہی میں نہیں کہ وہ رفائے الہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور نیت سے۔ ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے، غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں:

۱۔ اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس عالم الغیب ہونے کا، اس کا قدر مطلق ہونے کا اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جواب دہ ہونیکا کامل یقین ہے اور اس پوری مدت میں جبکہ وہ روزے سے رہا ہے اسکے یقین میں ذرا متزلزل نہیں آیا۔

۲۔ اس کو آخرت پر اسکے حساب کتاب پر اور اسکی جزا و سزا پر پورا یقین ہے اور یہ یقین بھی کلام

کم ان بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جب کہ وہ اپنے روزے کی شرائط پر قائم رہا۔

۳۔ اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نیت

کا خود مختار ہے۔ اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے۔ خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کی اندرونی تہوں میں اسکی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوت ارادی سے اسکا استیصال کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندی قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے۔

۴۔ مادیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کو انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا، اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مفرت کو قبول کر لیا۔

۵۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانہ میں روزہ رکھے، بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں، اور اسکی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

۶۔ اُس میں صبر، استقامت، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات و تحریمات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضا گاہ اپنی خواہشات نفس کو روکتا ہے۔ سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جا رہا ہے، برفاب سامنے موجود ہے، آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا۔ بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے، چاہے تو کھا سکتا ہے، مگر نہیں کھاتا۔ جوان میاں بیوی ہیں، خواہش نفس زور کرتی ہے، چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر نہیں کرتے۔ ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرف نظر، اور ممکن الاحترار نقصانات کی یہ پذیرائی، اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے